رسائل و مسائل

"مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش"

از جناب خان بہادر نواب محمد ذکاء اللہ خاں صاحب

"مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان سے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے مضامین کا ایک مجموعہ اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے۔ اب دوسرا مجموعہ اسی سلسلہ کے دوسرے حصہ کی حیثیت سے ترجمان القرآن کی ماہ شعبان، رمضان اور شوال سنہ ۱۳۵۸ھ کی مشترک اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ مولانا نے اپنے مضامین کے پہلے مجموعہ میں سیاسی کام کرنے کے اکثر ان طریقوں کو غلط اور مسلمانوں کے لیے مضر ثابت کرنے کی کوشش کی تھی جن پر مسلمانوں کے مختلف گروہ آجکل عمل پیرا ہیں[1]۔ مگر خود اپنا نصب العین اور اپنا طریقہ کار مسلمانوں کے سامنے پیش نہیں کیا تھا۔ لہذا مسلمانوں کو عموماً اور ناظرین ترجمان القرآن کو خصوصاً مولانا سے یہ شکایت تھی کہ اگر مسلمان مولانا کے تخریبی استدلال سے متاثر ہو کر دیگر سیاسی گروہوں سے اشتراک عمل ترک کر دیں تو آخر کیا کریں[2]؟ آیا معطل ہو کر بیٹھ جائیں یا کوئی

---

[1] افسوس ہے کہ فاضل تنقید نگار نے میرے اس رسالہ کے اصل مقصد ہی کو نہ پایا۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ میرا مقصد "سیاسی کام کرنے کے طریقوں" پر بحث کرنا تھا۔ حالانکہ میرا اصل مقصد مسلمانوں کی اس خود فراموشی کو دور کرنا تھا جسکی وجہ سے وہ یا تو حرکت ہی نہیں کر رہے ہیں یا اگر کر رہے ہیں تو ان کی حرکت اس شخص کی سی ہے جو اپنے آپ کو اور اپنی منزل مقصود کو نہیں جانتا اور بے سمجھے بوجھے چلنے لگتا ہے۔ م

[2] جو شخص اپنے زمانے کے عام طرز خیال اور طرز عمل کو بدلنا چاہتا ہو اور لوگوں کی روش میں اصولی تغیر پیدا کرنے کا خواہشمند ہو وہ مجبور ہے کہ ابتدا میں تخریبی تنقید پر زیادہ قوت صرف کرے اور تعمیری افکار کو آہستہ آہستہ بتدریج اور باقاعدہ پیش کرے۔ تخریبی تنقید کے بغیر وہ الفت اور شیفتگی دور نہیں کی جا سکتی جو لوگوں کو رائج الوقت تخیلات اور طریقہائے عمل سے طبعی طور پر ہوا کرتی ہے، اور جب تک یہ الفت دور نہ ہو ان کے دماغ کسی نئی بنیاد پر تعمیر کا نقشہ سوچنے اور سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔ لہذا تخریب کے بغیر یا ناکافی تخریب کے ساتھ نئی تعمیر کا پورا نقشہ پیش کر دینا سراسر نادانی ہے۔ میرے اس گمان کی صحت خود فاضل تنقید نگار کے اپنے مضمون ہی سے ثابت ہو رہی ہے۔ تخریبی تنقید کے ساتھ جو تعمیری خیالات میں نے پیش کیے تھے صاحب موصوف کو ان کے اندر کوئی تعمیریت نظر نہ آئی، محض اس لیے کہ تعمیر نو کا وہ تصور ان کے لیے بالکل اجنبی ہے جسے میں اور مجھ جیسے چند دیوانے مسلمانوں کی آئندہ قومی پالیسی کی اساس قرار دینا چاہتے ہیں۔ م

نیا طریقہ کار اختیار کریں[1]؟ مولانا کے مضامین کا یہ دوسرا حصہ بھی اگرچہ بڑی حد تک تخریبی تنقید ہی پر مشتمل ہے مگر بارے شکر ہے کہ یہ دوسرا حصہ تعمیری پہلو سے خالی نہیں ہے اگرچہ یہ تعمیری پہلو اب بھی بہت مختصر اور جویانِ عمل کو تشنہ کام رکھنے والا ہے[2]۔ مولانا نے اپنے دوسرے مجموعہ کے مقدمہ میں اپنے ان مضامین پر تحقیقی تنقید کا مطالبہ کیا ہے۔ اس مطالبہ کے جواب میں ذیل کی چند سطور ہدیہ ناظرین کی جاتی ہیں۔ مگر ایسا کرنے میں میرے لیے ایک دقت ہے اور وہ یہ کہ مولانا اپنے ان سیاسی مضامین پر دوسرے سیاسی گروہوں کے اماموں سے تنقید اور تبصرہ کے طالب ہیں درانحالیکہ راقم الحروف کے لیے کسی سیاسی گروہ کا امام ہونا تو کجا

---

[1] فاضل تنقید نگار کا گمان شاید یہ ہے کہ میرے ایک دو رسالوں کے شائع ہوتے ہی مسلمانوں کی تمام مختلف جماعتیں اپنے اپنے کام بند کر دینگی اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر ہو کر بیٹھ جائینگی کہ کب میری زبان سے دوسرا حکم نکلے اور وہ نئے طرز پر کام شروع کریں۔ اگر صاحب موصوف نے میری یہ حیثیت قرار دی ہے تو ان کے حسن ظن کا شکریہ۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ مجھے یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ میں ایک طرح کا "پروٹسٹنٹ" ہوں جو "آرتھوڈوکسی" پر تنقید کر کے اس میں اصولی تغیر کرانا چاہتا ہے۔ میری طرح کے پروٹسٹنٹ اور بھی قوم میں موجود ہیں۔ ہماری تنقید میں اگر کوئی طاقت ہوگی اور ہمارے تعمیری افکار میں اگر کچھ صالح اجزا ہونگے تو آہستہ آہستہ اس کے اثرات قوم کی زندگی میں جذب ہوتے چلے جائینگے اور بتدریج وہ تغیر واقع ہوگا جو ہمارے پیشِ نظر ہے قوموں کی زندگی میں تغیر طفرہ کی شکل میں نہیں ہوتا کہ ایک حالت سے چھلانگ لگا کر وہ دفعۃً دوسری حالت میں چلی جائیں، اور اگر سابق مقام سے اُچکا دینے کے بعد ان کو پاؤں ٹکانے کے لیے دوسری جگہ نہ بتائی جائے تو ہوا میں معلق رہیں۔ اجتماعی تغیرات ہمیشہ تدریجی نشو و نما کی صورت میں ہوا کرتے ہیں۔ اشخاص کی تنقیدیں اگر تجربات کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں تو قوم رفتہ رفتہ اپنے پرانے مسلک کو چھوڑتی جاتی ہے اور نئے تعمیری افکار میں اگر طاقت ہوتی ہے تو آہستہ آہستہ وہ قوم کی زندگی میں اس طرح جذب ہوتے ہیں جیسے ایک شخص کے جسم میں غذا کے اجزا جذب ہوا کرتے ہیں۔ م

[2] تشنگی تو عین مطلوب ہے۔ اس کے بغیر پانی حاضر کر دینا ایک فعل عبث کے سوا کچھ نہیں۔ م

وہ ایک ادنیٰ شاگرد کی حیثیت بھی نہیں رکھتا - اس لیے نہ معلوم میری تنقید یا تبصرہ مولانا کی توجہ کے قابل ہو بھی یا نہیں -

جو کاوش اور وقت نظر مولانا نے اپنے ان سیاسی مضامین پر صرف کی ہے اور جس تحقیق اور تلاش کے ساتھ مختلف سیاسی گروہوں کے نقطہ نظر پر معلومات سے پُر تنقید کرنیکے لیے مولانا نے ضروری مواد جمع کیا ہے سخت بے انصافی ہوگی اگر اس کا پورا پورا اعتراف نہ کیا جائے - مولانا کے یہ پُر از معلومات مضامین اس قابل ہیں کہ مسلمانوں کا ہر سیاسی گروہ خواہ اس کو مولانا کے استدلال اور نتائج سے کلی اتفاق ہو یا نہ ہو ان کو پوری توجہ کے ساتھ پڑھے اور اُن سے استفادہ کرے - خصوصاً اس دوسرے مجموعہ کے ابواب ششم و ہفتم اس قابل ہیں کہ ان کو شروع سے آخر تک نہایت ہی غور اور توجہ سے پڑھا جائے اور جو کچھ ان میں کہا گیا ہے اس سے سبق حاصل کیا جائے - جو کچھ ان ابواب میں کہا گیا ہے وہ ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کا کوئی گروہ اگر وہ تعصب سے کام نہ لے اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا - خصوصاً مسلمانوں کے اس گروہ کی عبرت اور بصیرت کے لیے جو کانگرس کی شرکت کا حامی ہے ان ابواب میں بہت کچھ مواد ملیگا -

اب تبصرہ اور تنقید کے طور پر مجھکو جو کچھ عرض کرنا ہے وہ حسب ذیل ہے -

میرے نزدیک مولانا کے لیے متعارف سیاسی گروہوں پر تنقید اور تبصرہ کا زیادہ بہتر طریقہ یہ ہوتا کہ جو سیاسی گروہ سیاسی میدان میں برسر عمل ہیں ان کے مسلّمہ مسلک اور طریقہ کار بیان کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ خود اپنا مسلک اور طریقہ کار بالتفصیل بیان فرماتے اور پھر شواہد اور دلائل سے ثابت کرتے کہ دیگر سیاسی گروہوں کا مسلک غلط اور ان کا طریقہ کار ناقص ہے اور اس کے وجوہ یہ ہیں اور مولانا کا مسلک اور طریقہ کار ان وجوہ سے بہتر اور مسلمانوں کے لیے مفید تر ہے - اگر مولانا نے ایسا کیا ہوتا تو ناظرین ترجمان القرآن کو خصوصاً اور مسلمانوں کو عموماً اس وقت تک کافی موقعہ اس کا مل چکا ہوتا کہ وہ دوسرے گروہوں کے مسلک اور طریقہ کار کا مولانا کے مسلک اور طریقہ کار سے تقابل اور توازن کر کے ایک رائے قائم کرتے کہ کون سا مسلک اور طریقہ کار مسلمانوں کے لیے بہتر

اور مفید تر ہے۔ مگر مولانا نے ایسا نہیں کیا۔

کانگریس اس وقت تک مولانا نے جس سیاسی گروہ سے اپنے مضامین میں زیادہ تر تعرض کیا ہے وہ کانگریس ہے مگر کانگریس سے تعرض کرنے کی صورت میں بھی کانگریس کے مسلّمہ مسلک اور طریقہ کار کو یعنی اس مسلک اور طریقہ کار کو جو کانگریس اپنے مختلف اجلاسوں میں اپنے مذہب یا (Creed) کے طور پر قائم کر چکی ہے، بالتفصیل بیان فرما کر اس کے نقائص، خامیوں اور مضرتوں کو ثابت نہیں کیا گیا ہے جیسا کہ چاہیے تھا۔ بلکہ جو طریقۂ استدلال مولانا نے اختیار فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ مثلاً پنڈت جواہر لال نہرو نے یا مسٹر آبس یا ڈاکٹر محمد اشرف یا ڈاکٹر سید محمود نے اپنی فلاں فلاں تحریر یا تقریر میں ان ان خیالات کا اظہار کیا ہے جو ان ان وجوہ سے مسلمانوں کے لیے مضر ہیں۔ مثلاً پنڈت جواہر لال نہرو کی اشتراکیت کے عقیدہ اور لامذہبیت کو بڑی حد تک کانگریس کا مسلک اور (Creed) قرار دے کر یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کانگریس ہندوستانیوں کو لامذہبیت اور اشتراکیت کی طرف لے جانا چاہتی ہے[ف] اور اس مسلک کو ظاہر ہے کہ مسلمان کسی طرح قبول نہیں

[ف] یہ صحیح نہیں ہے کہ میں پنڈت جی یا اس قسم کے دوسرے لوگوں کی لامذہبی یا اشتراکیت کو کانگریس کا مسلک یا عقیدہ قرار دے رہا ہوں۔ میں نے صرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "قوم پرست" جماعت ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک "واحد وطنی قومیت" میں جذب کرنا چاہتی ہے اور اس مقصد کے لیے وہ مسلمانوں میں یہ تبلیغ کر رہی ہے کہ نہ تمہاری کوئی مستقل قومیت ہے اور نہ تم ایسی کوئی تہذیب رکھتے ہو جو تمہیں ہندوستان کی عام آبادی سے ممتاز ایک جماعت بنانے کا اقتضاء کرتی ہو۔ یہ چیز مسلمانوں کے حق میں لامذہبیت ہے مگر ہندوؤں کے حق میں لامذہبیت نہیں ہے، کیونکہ ہندو خود حقیقت میں نہ کوئی "قوم" ہیں اور نہ ان کی کوئی تہذیبی ملت ہے، اس لیے کانگریس کے دائرۂ عمل میں یہ لامذہبی کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس حیثیت سے داخل ہے کہ وہ اس تبلیغ کو واحد ہندی قومیت کی تخلیق کے لیے مفید سمجھتی ہے۔ رہی اشتراکیت تو میں صاف کہہ چکا ہوں کہ وہ کانگریس کا مسلّمہ مسلک نہیں ہے، مگر کانگریس کی طرف سے جس جماعت نے مسلمانوں میں ماس کانٹیکٹ کا کام کیا ہے وہ زیادہ تر اشتراکی خیالات پھیلاتی رہی ہے اور کانگریس کے کارفرماؤں نے اس کو کم از کم گوارا ضرور کیا ہے۔ میرے نزدیک ان کے اس چیز کو گوارا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے مقاصد کے لیے اشتراکی تبلیغ کو کم از کم اس حد تک مفید ضرور سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی اجتماعی ہیئت جو اب تک بُری یا بھلی جیسی کچھ بھی بندھی ہوئی ہے، اس تبلیغ کے اثر سے پارہ پارہ ہو جائیگی اور معاشی طبقات میں منقسم ہو کر مسلمان وہ ہولناک سیاسی بلاک نہ بنا سکیں گے جس سے عہدہ برآ ہونے میں ان کو طرح طرح کی مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ اگر کوئی شخص میرے اس استدلال اور استنباط کو درست نہ سمجھتا ہو تو وہ اپنی فہم کا مالک ہے، مگر اسے یہ حق تو نہیں پہنچتا کہ میری طرف ان خیالات کو منسوب کر دے جو در اصل میرے نہیں ہیں۔ م

کر سکتے۔ یہ طریقہ استدلال کم از کم راقم الحروف کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ کسی گروہ کے کسی فرد یا افراد کی ذاتی رائیں، خواہ وہ کتنی ہی سربرآوردہ اور بلند شخصیت کے مالک کیوں نہ ہوں، اس قابل نہیں کہی جا سکتیں کہ ان کو اس گروہ کا مسلّمہ مسلک قرار دے کر ان سے استدلال کیا جائے۔ مولانا کانگریس کے مسلّمہ مسلک سے تعرض کرتے وقت یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہوتے کہ گو کانگریس کا لفظاً مسلک وہ ہے جو کانگریس اپنے مختلف اجلاسوں میں پاس کر چکی ہے، مگر معناً وہ ہے جو مثلاً پنڈت جواہر لال نہرو یا سوباش چندر بوس بیان کرتے ہیں تاہم تنقید اور تبصرہ کانگریس کے مسلّمہ مسلک ہی پر ہونا چاہیے تھا۔[۱]

یہ ضرور ہے کہ کانگریس میں ایک محدود گروہ ایسا ضرور ہے جو لامذہبیت اور اشتراکیت کا حامی ہے مگر یہ آسانی سے تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ یہ محدود گروہ کانگریس کی اکثریت سے مستقبل قریب میں اپنے مسلمات منوا کر چھوڑے گا۔ قرائن اور شواہد کیا ہیں؟ کانگریس عموماً اور مہاتما گاندھی خصوصاً کتنے عرصہ سے اچھوت ادھار اور مندروں میں اچھوت اقوام کے داخلے (Temple Entry) کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں مگر اس وقت تک اس مقصد میں کہاں تک کامیابی ہوئی؟ ہندوستان میں کتنے مندر ہیں جن میں اچھوتوں کو بلا روک ٹوک داخلہ کی اجازت مل گئی ہے؟ کتنے شہر یا قصبات ہیں جن میں اچھوت بلا مزاحمت اعلیٰ بستی کے ہر کنوئیں سے پانی بھر سکتے ہیں؟ ان واقعات کو دیکھتے ہوئے یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ کانگریس کی وہ اقلیت جو کوئی مذہب نہیں رکھتی سارے ہندوستان کو لامذہبیت کی طرف لے جانے میں کامیاب ہو گی؟

اسی طرح قرائن یہ چاہتے ہیں کہ خود ہندوؤں کی طرف سے اشتراکیت کی مخالفت اس سے بہت زیادہ ہو جتنی مسلمانوں کی جانب سے کیونکہ ہندوؤں میں سرمایہ داروں کی اور بڑے زمینداروں کی مسلمانوں کے

۱؎ فاضل مضمون نگار کو شاید اندازہ نہیں ہے کہ جماعتوں کے نفس کا حقیقی اظہار ان کے مختاط طریقہ پر مرتب کیے ہوئے ریزولیوشنوں اور دفتری اعلانات میں نہیں ہوا کرتا، بلکہ ان اشخاص کے انتخاب میں ہوتا ہے جنہیں وہ اپنا لیڈر اور کارفرما اور کارکن بناتی ہیں اور جن کے کام کو وہ ایک طویل مدت تک نظر استحسان سے دیکھتی رہتی ہیں۔ م

مقابلہ میں بہت زیادہ کثرت ہے۔ لہذا کانگریس کی اکثریت کا لامذہبیت اور اشتراکیت کی طرف بکلی رجوع کر جانا منطقی طور پر ناممکن نہیں تو بعید از قیاس ضرور ہے[1]۔ مسلمانوں کے لیے کانگریس کی شرکت اور کانگریس میں مدغم ہو جانا اگر پُرخطر ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ کانگریس کے چند سربرآوردہ افراد کے کیا خیالات اور کیا رجحانات ہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ عام ہندو پبلک میں مسلمانوں کی طرف موافقت نہیں بلکہ مخالفت اور منافرت ہے۔ کانگریس کے چند افراد کا مطمح نظر یا (Ideal) کتنا ہی بلند اور عدم تعصب اور عدم منافرت پر مبنی کیوں نہ ہو، کانگریس کے عوام کا مطمح نظر اب تک نہ وہ رہا ہے نہ رہ سکتا ہے۔ کوئی ہندوستانی خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ۴ر چندہ دے کر اور کانگریس کے رجسٹر میں نام لکھوا کر کانگریس کا ممبر بن جاتا ہے۔ کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ ۴ر چندہ دینے اور ایک رجسٹر میں نام لکھوا دینے سے اس نئے کانگریسی ممبر کی اندرونی کایا پلٹ ہو گئی؟ یہی خطرہ ہے جس سے بچنے کے لیے اور جس سے اپنا تحفظ کرنے کے لیے مسلمانوں نے مسلم لیگ کے ذریعہ سے باوجود اسکے کہ ان کو کانگریس سے کوئی خاص عناد اور مخالفت نہیں ہے مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم کو ضروری سمجھا اور اس پر کانگریس کی شرکت کے تلخ تجربوں کے بعد عمل شروع کر دیا۔

مسلم لیگ اسی طرح مولانا نے اس وقت تک مسلم لیگ کا مسلک اور طریقۂ کار بھی پبلک کے سامنے پیش نہیں کیا، نہ اس کے نقائص اور خامیوں سے (اگر کچھ ہیں) پبلک کو آگاہ کیا، نہ یہ بتایا کہ مسلم لیگ کا مسلک اور طریقۂ کار اس قدر غلط اور ناقص ہے کہ مسلم لیگ کے ساتھ مولانا اور ان کے ہم خیال بزرگوں کو کسی طرح اشتراک عمل کرنا جائز نہیں ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ مولانا مسلم لیگ کے مسلک اور طریقۂ کار کو عوام کے سامنے پیش کرتے، اس کے نقائص اور خامیوں کو دکھاتے، اس کے متعلق ضروری ترمیمات پیش کرتے اور کہتے کہ اگر مسلم لیگ اپنے مسلک اور طریقۂ کار میں فلاں فلاں ترمیمات کرے تو ہم اس کے ساتھ ہیں[2]؟

[1] یہ تمام بحث غیر متعلق ہے۔ اس کا جواب حاشیہ ۳ میں گزر چکا ہے۔ م

[2] حاشیہ نمبر ۵، صفحہ ۱۴۰ پر ملاحظہ ہو۔

مسلم لیگ کے متعلق مولانا نے اپنے پہلے مجموعہ مضامین یا اس دوسرے مجموعہ مضامین میں کوئی صاف اظہار رائے نہیں فرمایا ہے مگر مولانا نے جو نوٹ ماہ جمادی الاول ۵۸ھ کے ترجمان القرآن میں صفحہ ۲۳۹ پر الجمعیت کے مضمون کے جواب میں تحریر فرمایا ہے اس سے مسلم لیگ کے متعلق مولانا کی رائے کا صاف صاف اظہار ہو جاتا ہے۔ اس نوٹ میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:۔

حاشیہ نمبشر۔ فاضل تنقید نگار کا یہ ارشاد بے بنیاد ہے کہ میں مسلم لیگ کا مخالف اور ایسا سخت مخالف ہوں کہ اس کے ساتھ اشتراک عمل کو ناجائز سمجھتا ہوں۔ نیز ان کا یہ خیال بھی درست نہیں ہے کہ میں نے اس کا نام لیے بغیر اپنی تنقیدات میں اسکی بعض خامیوں کی طرف جو اشارات کیے ہیں ان کا مقصد لوگوں کو مسلم لیگ کی شرکت سے روکنا ہے۔ درحقیقت مسلم لیگ ہو یا مسلمانوں کی بڑی سیاسی جماعتوں میں سے کوئی اور جماعت، اس کے مسلک یا طریق کار پر تنقید کرنے سے میرا مدعا یہ کبھی نہیں رہا ہے کہ ان جماعتوں کی تخریب کروں، بلکہ میرا مدعا یہ ہے کہ جو لوگ ان جماعتوں میں شریک ہیں یا آئندہ شریک ہوں وہ ایک صحیح نقطۂ نظر اختیار کریں اور ایک ایسی رائے عام پیدا ہو جائے جسکے نتیجہ میں ان جماعتوں کی اصلاح بھی ہو اور یہ مختلف جماعتیں کم از کم نصب العین کے اعتبار سے ایک دوسرے سے قریب تر ہوتی چلی جائیں۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں معاملات کو جماعتوں کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ محض اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں۔ اسی لیے میں نے اب تک سیاسی مسائل پر جو کچھ لکھا ہے اس میں کسی مسئلہ پر بھی اس حیثیت سے بحث نہیں کی ہے کہ کسی خاص جماعت کی نسبت سے اس مسئلہ کی کیا نوعیت ہے؟۔ میں صرف یہ دیکھتا ہوں اور یہی دکھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ اسلام کی نسبت سے صحیح یا غلط اور مناسب یا نامناسب کیا ہے۔ اور اس سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ عامۂ مسلمین میں شعور اور بصیرت پیدا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کی قومی جماعتوں میں اس وقت مقاصد یا طریق عمل یا قیادت کے اعتبار سے جو کچھ بھی خامیاں پائی جاتی ہیں ان سب کی اصلی وجہ عامۂ مسلمین کی پراگندہ خیالی ہے۔ عام مسلمانوں کے خیالات جب صاف ہو جائینگے، جب وہ اپنے سیاسی موقف کو اچھی طرح سمجھ لینگے، جب وہ اپنے قومی نصب العین کو پورے وضوح اور تعین کے ساتھ دیکھنے لگینگے اور جب ان میں اس نصب العین تک پہنچنے کا طاقتور ارادہ پیدا ہو جائیگا تو یہ خامیاں خود بخود دور ہو جائینگی۔ اس وقت قوم کی ایک ہی بڑی اور اصلی جماعت ہوگی، باقی تمام جماعتیں جو قومی ارادہ کے خلاف چلینگی گوشۂ خمول میں جا پڑینگی اس وقت یا تو موجودہ لیڈروں کو اپنی پالیسی بدلنی پڑیگی یا قومی شعور ان کے بجائے دوسرے لیڈر تلاش کرلیگا۔ اس وقت قومی نصب العین کی طرف صحیح حرکت شروع ہوگی اور یہ خام کاریوں اور غلط کاریوں کا دور ختم ہو جائیگا۔ م

"مسلم لیگ کی حمایت میں اگر میں نے کوئی لفظ لکھا ہو تو اس کا حوالہ دیا جائے۔ رہی یہ بات کہ میں اس کی مخالفت کیوں نہیں کرتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ میرے نزدیک اس وقت مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ مہلک آپ کی جماعت (کانگریس میں شریک ہونے والے مسلمانوں کی جماعت) کا رویہ ہے اس لیے میں سب سے پہلے آپ کی طرف متوجہ ہوا ہوں آپ راہ راست پر آجائیں تو انشاء اللہ دوسروں کی بھی باری آجائیگی۔ حدیث میں ہے کہ جب انسان دو بلاؤں میں مبتلا ہو تو چھوٹی بلا کو اختیار کرے۔"

گویا مولانا مسلم لیگ کی طرف اس وقت متوجہ ہونگے جب مسلمانوں کا وہ گروہ جو کانگریس میں شرکت کرتا ہے یا کانگریس کی شرکت کا حامی ہے راہ راست پر آجائے یعنی کانگریس کی حمایت اور کانگریس کی شرکت سے توبہ کرے۔ مگر مولانا نے مسلمانوں کو یا ناظرین ترجمان القرآن کو یہ نہیں بتایا کہ اس مقصد کے حصول کے لیے اندازاً کسقدر مدت درکار ہوگی؟ اور اگر مولانا دس پندرہ یا بیس برس تک کانگریس میں شرکت کرنے والے مسلمانوں کو راہ راست پر لانے میں کامیاب نہیں ہوتے تو کیا اس وقت تک ان مسلمانوں کی اصلاح کا کام جو مسلم لیگ کے حامی ہیں معرض التواء میں رہیگا؟ نہ یہ بتایا کہ اس اثناء میں عامۃ المسلمین موجودہ سیاسی جنگ کے متعلق کیا رویہ اختیار کریں؟ آیا کسی راہ پر چلیں یا تعطل کی حالت میں پڑے رہیں؟ اور کیا موجودہ سیاسی کشمکش میں کسی گروہ کا کسی عرصہ کے لیے بھی تعطل کی حالت میں رہنا اس گروہ کے لیے سخت مضرت رساں نہیں ہے؟ ①

نصب العین اور طریقۂ کار

میں پہلے ہی اشارہ کرچکا ہوں کہ مولانا نے اپنے اس دوسرے مجموعہ مضامین میں اپنے نصب العین اور طریقۂ کار کا اظہار فرمایا ہے اور اس ضمن میں انہوں نے تین خاکے پیش کیے ہیں جن کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ دوم صفحہ ۲۱۲ تا ۳۱۹۔ یہ تینوں خاکے جو ظاہر ہے کہ

① فاضل تنقید نگار کے سامنے ہر موقع پر ٹائم ٹیبل کا سوال آجاتا ہے۔ انہوں نے پندرہ بیس برس کا زمانۂ تعطل بہت کم تجویز فرمایا۔ بحث کی خاطر ایک صدی بھی فرض کی جاسکتی تھی اور اس صورت میں تعطل کے اتنے ہولناک نتائج بیان کیے جاسکتے تھے کہ ان کے تصور ہی سے روح کانپ جاتی۔ م

سخت ذہنی کاوش اور دماغ سوزی کا نتیجہ ہیں، اس کے مستحق ہیں کہ ہم مسلمان خواہ وہ کانگریسی ہوں یا مسلم لیگی ان پر پوری توجہ کریں اور ان میں کا جو خاکہ کُلاً یا جزءً ہمارے نزدیک اختیار کرنے کے قابل ہو اُس کو اختیار کریں۔ خصوصاً پہلا خاکہ خاص توجہ کا مستحق ہے، خاصکر اس کا وہ جزو جو مرکز میں "مساویانہ حصہ داری" کا مطالبہ کرتا ہے۔ خواہ کوئی دستورِ حکومت (Constitution) بھی ہندوستان میں رائج کیا جائے مرکز میں مسلمانوں کے لیے مساوی حصہ داری بالکل لازمی چیز ہے۔

جہاں تک نصب العین کا تعلق ہے اس کو مولانا نے بہت ہی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے اس کو حاصل کرنے کے طریقہ کے متعلق مولانا فرماتے ہیں کہ وہ انقلابی ذرائع کے سوا کسی دوسرے طریقہ سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہاں پہونچکر اگر مولانا سے کوئی یہ دریافت کرنے کی جرأت کرتا ہے کہ وہ انقلابی ذرائع کیا ہیں تو وہ مولانا کے سخت عتاب کا مورد بنتا ہے۔ اس کے جواب میں مولانا سخت برافروختگی کے ساتھ فرماتے ہیں۔[۱]

[۱] محترم مضمون نگار ان الفاظ کو پھر ملاحظہ فرمائیں۔ ان میں عتاب اور برافروختگی ہے یا امرِ واقعی کا اظہار؟ اصل بات یہ ہے کہ جو کچھ میں نے اپنی کتاب کے آخری حصہ میں لکھا ہے اسکی معنویت کو صرف ایک انقلابی آدمی ہی سمجھ سکتا ہے۔ آئینی دماغ مجبور ہیں کہ میرے ان فقروں میں برافروختگی کے سوا کوئی چیز نہ پائیں۔ آئینی طور پر کام کرنے والے حضرات اسکے عادی ہوتے ہیں کہ کسی راستے پر پہلا قدم رکھنے سے پہلے پورے سفر کے لیے ایک مفصل اسکیم اور معین ٹائم ٹیبل ان کے سامنے موجود ہو۔ لیکن انقلابی طریق کار میں یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ یہاں پہلے قدم کا رُخ اور اس کا پیمانہ بھی اس وقت تک معین نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ اس امر کا پورا اندازہ نہ کرلیا جائے کہ قوم کا انقلابی رجحان کس حد تک پختہ ہوچکا ہے اور وہ اپنے نصب العین کے لیے جان لڑانے پر کہاں تک آمادہ ہے۔ لہٰذا ہر وہ شخص جو انقلابی طریق کار سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہو، اُس داعی انقلاب کا مضحکہ اڑائیگا جو قوم میں انقلابی رجحان پیدا کرنے کے لیے پہلی آواز منہ سے نکالتے ہی انقلابی حرکت کے لیے ایک مفصل اسکیم بھی شائع کردے۔ م

"میں حیران ہوں کہ اس کا کیا جواب دوں - جب تک کہ قوم کی ایک بڑی تعداد ایک نصب العین پر متحد نہ ہو جائے اور ہر قیمت پر اسے حاصل کرنے کا عزم صحیح اس میں پیدا ہو جائے انقلابی ذرائع کی ایک فہرست پیش کر دینا کسی یاوہ گو ہی کا کام ہو سکتا ہے اور میں یاوہ گوئی سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔"

مولانا مجھ کو معاف فرمائیں اگر میں عرض کروں کہ مسلمان ان سے انقلابی ذرائع کی فہرست طلب کرنے میں بالکل حق بجانب ہیں اور مولانا کی ایسے مطالبہ پر برہمی بالکل ہی ناواجب ہے۔ مسلمانوں کے سامنے ایک نصب العین پیش کر دینا اور یہ کہدینا کہ یہ انقلابی ذرائع کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اور اس کے آگے ساکت ہو جانا مسلمانوں کی ہرگز بھی رہنمائی نہیں ہے - اگر فرض کر لیا جائے کہ مولانا کے استدلال سے متاثر ہو کر مسلمانوں کا کوئی گروہ کانگریس اور مسلم لیگ کو بڑی اور چھوٹی بلا[۱] تصور کر کے ان دونوں سیاسی گروہوں کی شرکت کو گناہ عظیم تصور کرلے اور مولانا کے نصب العین کو تسلیم کرلے اور اس بات کو بھی تسلیم کرلے کہ یہ نصب العین بغیر انقلابی ذرائع اختیار کیے ہوئے حاصل نہیں ہو سکتا تو اس کے بعد انقلابی ذرائع کے عدم علم کی وجہ سے اس کے لیے کوئی چارہ کار نہ رہیگا سوائے اس کے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائے اور ہر قسم کی حرکت سے اجتناب کرے اگرچہ حرکت ہی زندگی کا نام ہے اور حرکت کی ضد موت کے مترادف ہے۔ مسلمانوں کے سامنے ایک نصب العین پیش کرنا اور اس کے حصول کے ذرائع بتانے سے اجتناب کرنا اگر سعی لاحاصل نہیں ہے تو کیا ہے درانحالیکہ ایک سچے رہنما کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ جو نصب العین وہ اپنے متبعین کے سامنے پیش کر رہا ہے اس کے حصول کے ذرائع بتا دے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اُن

[۱] لفظ "بلا" جس موقع پر استعمال کیا گیا ہے، افسوس ہے کہ فاضل تنقید نگار نے اس کا لحاظ نہیں فرمایا۔ کسی لفظ کو عبارت کے سیاق وسباق اور محل استعمال سے الگ کر کے مجرد لغت کے اعتبار سے معنی اخذ کرنا کم از کم ایک ایسے لائق بزرگ کے لیے تو موزوں طریقہ نہیں ہے جو سالہا سال کا عدالتی تجربہ رکھتے ہوں - جہاں میں نے یہ لفظ استعمال کیا ہے وہاں میرا مدعا صرف یہ بتانا تھا کہ اگر تمہارا حریف گنہگار رہیں تو تم انکی آنکھ کا تنکا دیکھنے سے پہلے اپنی آنکھ کا شہتیر تو دیکھو کہ تم زیادہ بڑا گناہ کر رہے ہو - م

ذرائع پر خود عمل کر کے دکھائے اور اپنی مثال سے اپنے متبعین میں ان ذرائع پر عمل کرنے کی ہمت پیدا کرے۔ مسلمانوں کے اسلاف اور خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا۔ ہجرت نبوی سے پہلے مسلمانوں کے لیے جہاد مفید طریقہ کار نہیں تھا بلکہ ایثار اور کفار کی جبر و تعدی پر صبر و استقلال سے کام لینا ہی مناسب طریقہ عمل تھا۔ چنانچہ حضور اقدس نے خود بھی عدیم المثال صبر و تحمل سے کام لیا اور مسلمانوں میں بھی اپنی اس مثال سے اس جذبہ کا بیج بویا۔ غالباً آج کل عدم تعاون اور سول نافرمانی حضور کے زمانہ کے صبر و تحمل کا ادنیٰ چربہ ہے۔ ہجرت نبوی کے بعد جب مسلمان اس قابل ہوئے کہ کفار کی زیادتیوں اور جیرہ دستیوں کا ترکی بہ ترکی جواب دے سکیں تو جہاد کی آیات نازل ہوئیں اس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو جہاد کے طریقوں کی محض زبانی تلقین نہیں کی بلکہ بہ نفس نفیس اُن طریقوں پر عمل کر کے اور ایک نہیں دو نہیں بلکہ بیسیوں غزوات میں شرکت فرما کر مسلمانوں کو بتا دیا کہ جہاد ایسے کرتے ہیں۔ اسی طرح خلفاء راشدین کے زمانے میں اعلائے کلمۃ اللہ مسلمانوں کا نصب العین اور منتہائے نظر تھا لہذا اس کے حصول کے جو ذرائع تھے ان کو برت کر خود خلفاء نے مسلمانوں کی رہنمائی فرمائی۔ اپنے اسلاف کے زمانہ سے قطع نظر کر کے خود ہم اپنے زمانہ کی مختلف تحریکوں خصوصاً کامیاب تحریکوں کی طرف نظر کرتے ہیں تو ہم پاتے ہیں کہ ان تحریکوں کے محرک صرف ایک نصب العین پیش کرتے ہیں اور اس کے حصول کے طریقے بتاتے ہیں بلکہ خود ان پر عمل کر کے بھی دکھا دیتے ہیں۔ ہندوستان میں کانگریس اور مسلم لیگ اس کی مثالیں ہیں اور یورپ میں ہٹلر کی ناززم (Nazism) اور مسولینی کی فیسزم (Fascism)

لہذا مولانا کے ذہن میں اپنے نصب العین کے حصول کے جو انقلابی ذرائع ہوں یہی نہیں کہ مولانا ان کی فہرست پیش کریں بلکہ ان پر خود بھی فوراً عمل شروع کر دیں۔ اگر مولانا ایسا نہیں کرتے تو گو وہ کانگریس اور مسلم لیگ کے راہبروں پر کجروی کا الزام لگا دیں، خود اُن پر یہ الزام عاید ہوتا ہے کہ

اُنکی کوئی راہ عمل ہے ہی نہیں اور اُن کے متبعین[۱۲] کو سوائے اسکے کہ وہ جمود اور تعطل کی حالت میں رہیں اور کوئی چارۂ کار نہیں - اگر مولانا کے نزدیک ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ انقلابی ذرائع استعمال کیے جائیں تو مولانا پر فرض ہے کہ اپنے پیروؤں اور عام مسلمانوں کو بتائیں کہ موجودہ سیاسی جنگ میں اُن کو کس قسم کے ہتھیار استعمال کرنے چاہئیں - آیا وہ اپنے پیرؤں کو عدم تعاون یا سول نافرمانی کی طرف لیجانا چاہتے ہیں ؟ یا وہ یہ چاہتے ہیں کہ جو کوئی بھی گورنمنٹ برسر اقتدار ہو، خواہ وہ کانگریسی گورنمنٹ ہو جیسا کہ اکثر صوبوں میں ہے، یا مسلم لیگ کی گورنمنٹ ہو جیسا کہ بعض صوبوں میں ہے، یا برٹش امپیریلزم ہو جیسا کہ ابھی تک مرکز (Centre) میں ہے، اس کے ساتھ مسلمانوں کو پورا پورا تعاون کرنا چاہیے ؟ اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو مولانا کی طرف سے مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش میں کسی قسم کی رہنمائی نہیں کی جاتی - اگر عام مسلمانوں کو مولانا کے ہر دو مجموعۂ مضامین پڑھنے کے بعد بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اُن کو کیا کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ مسلمان ایک گومگو کی حالت میں رہینگے جو آنکے سیاسی مستقبل کے لیے سخت مضر ہے -

چونکہ مولانا کو ان انقلابی ذرائع کی فہرست پیش کرنے سے احتراز ہے جنکا اختیار کرنا اُن کے پیش کردہ نصب العین کے لیے ضروری ہے اسلیے ظاہر ہے کہ مولانا کے نزدیک ابھی وقت نہیں آیا کہ مسلمان انقلابی ذرائع اختیار کرکے اپنا نصب العین حاصل کریں - اس لیے جو ذرائع بھی حصول مقصد کے مولانا کے نزدیک مناسب وقت ہوں وہ مسلمانوں کو بتائے جائیں اور انکے اختیار کرنے کی مسلمانوں کو دعوت دی جائے - نیز ایسی صورت میں اگر دوسری سیاسی جماعتیں انقلابی ذرائع اختیار کرنے سے پرہیز کرتی ہیں تو مولانا کو ان پر کسی

---

[۱۲] فاضل مضمون نگار کو شائد معلوم نہیں کہ ادارۂ دارالاسلام کا ایک مستقل پروگرام ہے جس پر اپنے محدود ذرائع کے ساتھ ہم نے کام شروع کر دیا ہے - اگر ہم اپنے کام کا اشتہار نہیں دیتے تو اسکے معنی یہ نہیں کہ ہم معطل بیٹھے ہوئے ہیں - اور یہ بھی ہمارے کام کا ایک شعبہ ہی ہے کہ مسلمانوں میں صحیح اجتماعی شعور پیدا کیا جائے تاکہ وہ جمہوری تحریکات جو اس وقت عامۂ مسلمین میں چل رہی ہیں، ایک ذی شعور رائے عام کے اثر سے صحیح رخ پر چلنے لگیں - م

اعتراض کا موقع باقی نہیں رہتا۔

خالص جمہوریت | مولانا نے خالص جمہوریت کو ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے مضر قرار دیا ہے۔ مولانا کی اس رائے سے بہت سے دوسرے مسلمانوں کو بھی اتفاق ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ مسلمان موجودہ جنگ آزادی کی طرف اس شوق اور شغف کے ساتھ نہیں بڑھے جیسا کہ ہندو۔ خالص جمہوریت سے جن خطرات کا اندیشہ ہے انہیں سے بچنے کے لیے مولانا نے "ہمارا نصب العین اور طریق کار" والے باب میں مستقبل ہند کی تعمیر کے لیے تین خاکے پیش کیے ہیں جنکا مذکور اوپر ہو چکا۔ فرض کرو کہ ان تین خاکوں میں سے کسی ایک پر خواہ مفاہمت کے ذریعہ سے یا انقلابی ذرائع سے عملدرآمد ہو گیا اور مسلمانوں کو اپنے اندرونی انتظام میں پوری حکومت خود اختیاری حاصل ہو گئی پھر بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ مسلمانوں کا یہ اندرونی نظام خالص جمہوریت پر قائم ہوگا یا کسی اور صنف کے طرز حکومت پر؟[13] مولانا کو اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالنی چاہیے تھی"

[13] براہ کرم حسب ذیل عبارات کو دوبارہ بنظر غور ملاحظہ فرما لیا جائے:۔

"اسی طرح ہمارے سامنے اصلی سوال یہ بھی نہیں ہے کہ اس ملک کے نظام حکومت کا ارتقاء جمہوریت کے راستہ پر ہو یا کسی دوسرے راستہ پر۔ کوئی خردمند نفس جمہوریت کی مخالفت نہیں کر سکتا اور نہ یہ کہہ سکتا ہے کہ یہاں بادشاہی یا امراگردی (دستاکریسی) یا اور کسی طرز کی حکومت ہونی چاہیے۔ دراصل جو سوال ہمارے لیے ایک مدت سے پریشان کن بنا ہوا ہے اور روز بروز زیادہ پریشان کن بنتا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ گزشتہ ستر اسی سال سے ہندوستان میں انگریزوں کی غلط رہنمائی و فرمانروائی اور ہندوؤں کی خوش نصیبی و خود غرضی کے سبب سے نظام حکومت کا نشو و ارتقاء واحد قومیت کے مفروضہ پر جمہوری طرز ادارہ کی صورت میں ہو رہا ہے۔ نفس جمہوریت کو اور اس جمہوری طرز ادارہ کو جو واحد قومیت کے مفروضہ پر مبنی ہو ایک دوسرے سے خلط ملط نہ کرنا چاہیے۔ دونوں میں زمین و آسمان کا بل ہے اور ایک سے اختلاف کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم دوسرے سے اختلاف کر رہے ہیں" (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ دوم صفحہ ۳۰۲-۳۰۳)

"اگر ہندوستان ایک قوم کا نہیں بلکہ کم از کم دو یا اس سے زائد قوموں کا ملک ہے تو یہاں خالص جمہوریت کے وہ اصول ہرگز نہیں چل سکتے جو صرف ایک قوم کے لیے موزوں ہیں۔ دو الگ قوموں کی ایک ڈیموکریسی اصولاً غلط ہے ..... اور یہ قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ ایسی جمہوریت دراصل ایک قوم پر دوسری قوم کی تیسری بہت مسلط کرنے کا مجرب نسخہ ہے" (ایضاً صفحہ ۳۰۹)

ان فقروں کو پڑھ کر فاضل تنقید نگار اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ میں جس جمہوریت کا مخالف ہوں وہ کونسی ہے۔ رہا یہ سوال کہ مسلمانوں کا اندرونی نظام کس طرز پر قائم ہونا چاہیے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں مغربی اصول جمہوریت کے مقابلہ میں اسلامی اصول جمہوریت کو ہر لحاظ سے بہتر سمجھتا ہوں۔ اسکی مختصر تشریح رجب ۱۳۵۸ھ (۶۶) کی اشاعت میں صفحہ ۱۰۱-۱۰۳ پر کی جا چکی ہے۔ م

عام مسلمانوں کی واقفیت کے لیے اور نیز علمائے کے گروہ کی آگاہی کے لیے - کیونکہ جیسا کہ میں اپنے ایک پہلے مضمون میں عرض کر چکا ہوں علماء کے گروہ میں اس جمہوری طرزِ حکومت کے متعلق غلط فہمی ہے اور میرے خیال میں علماء کے گروہ میں ایسے لوگ ضرور ہیں جو اس مغرب سے آئے ہوئے خالص جمہوری طرز حکومت کو اسلام کے خلاف تصور کرتے ہیں - اگرچہ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اسلام ہی وہ پہلا مذہب ہے جس نے خلافت میں وراثت کو ممنوع قرار دیکر اور و امرھم شوریٰ بینھم کا فرمان واجب الاذعان جاری فرماکر خالص جمہوری حکومت کی بنیاد ڈالی - اگرچہ ہم مسلمانوں نے اپنی کجرائی اور نااہلیت سے خالص جمہوریت کا جو پودا بانئ اسلام نے لگایا تھا اسکو پھلنے پھولنے نہیں دیا اور وہ پودا جلد ہی یعنی خلافتِ راشدہ کے بعد ہی جل کر خاکستر ہو گیا اور خالص جمہوریت کی جگہ شخصی مطلق العنان حکومت نے لے لی جسکا نتیجہ یہ ہے کہ اس باب میں ہم کو مجبوراً مغرب ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے -

اسلام اور وطنیت | مولانا نے اپنے مضامین میں اس بات پر بہت زور دیا ہے اور بجا طور پر زور دیا ہے کہ مسلمانوں کو ہر حال میں اسلام کو وطنیت پر مقدم رکھنا ہوگا - مگر یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ مسلمان عموماً یا مسلمانوں کا کوئی خاص گروہ (افراد کو چھوڑ کر) اس اصول موضوعہ سے منحرف ہے اور وطنیت کو اسلام پر ترجیح دیتا ہے -[۱۴۱]

[۱۴۱] کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ مسلمانوں میں کوئی گروہ اسلام پر وطنیت کو ترجیح دینے والا نہیں ہے ؟ اگر محترم تنقید نگار کا ایسا خیال ہے تو وہ یا تو واقعات کو قصداً نظر انداز کر رہے ہیں، یا ان سے بے خبر ہیں - اور ان کا یہ قول بھی صحیح نہیں ہے کہ میرے نزدیک عام مسلمانوں میں وطن پرستی پیدا ہو گئی ہے - میں جو کچھ کہتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں وطن پرستی پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور خود مسلمانوں کا ایک گروہ اس سے نہ صرف متاثر ہو گیا ہے بلکہ اس کی اشاعت میں حصہ لے رہا ہے لہذا اس کی مزاحمت کرنا ضروری ہے - تحریک خلافت وغیرہ کا جو ذکر تنقید نگار نے کیا ہے وہ صرف اس امر کا ثبوت ہے کہ عام مسلمان اب تک وطن پرستی سے محفوظ رہے ہیں - یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ مسلمانوں میں کوئی گروہ اس بیماری سے متاثر نہیں ہوا ہے - م

اگر ایسا ہوتا تو مسلم لیگ علٰحدہ وجود میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ مسلم لیگ کبھی کی کانگریس میں مدغم ہو چکی ہوتی یا دیگر اسلامی ممالک پر جو پچھلے تیس پینتیس سال میں مصیبتیں آئیں ان سے ہندوستانی مسلمان بالکل متاثر نہ ہوتے یا جو خلافت کی تحریک ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۲ء کے درمیان ہندوستان میں برپا ہوئی اور جس نے اُس زمانہ کی کانگریسی تحریک کو اس قدر قوت پہونچائی وہ ہرگز وجود میں نہ آتی۔ طرابلس پر اٹلی حملہ کرتا ہے اور وہاں کے مسلمانوں کا خون بہاتا ہے اور ہندوستان کا مسلمان ہزاروں میل کے فاصلہ پر بیٹھا ہوا بیتاب ہوجاتا ہے اور علامہ اقبال کی زبانی یہ کہہ اٹھتا ہے:

گر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں — جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں — طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

اس جذبہ اسلامی کے اگر کچھ معنی ہیں تو صرف یہ کہ اسلام کسی جغرافی حدود میں محدود نہیں ہے بلکہ ایک بین الاقوامی مذہب (International Religion) ہے۔

باقی

مسئلہ قومیت

تالیف سید ابوالاعلیٰ مودودی

یہ مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے اصول قومیت کی تشریح کر کے ثابت کیا گیا ہے کہ مسلمان نسلی یا وطنی قومیت کے اصول قبول نہیں کر سکتے، نہ غیر مسلموں کے ساتھ مل کر کوئی قومیت بنا سکتے ہیں۔ قیمت ۸ر۔ محصول ڈاک پانچ پیسے۔

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجیے